قسط:۲۴

ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے گورنمنٹ کالج لاہور:

۱۹۵۶ء-۵۷ گورنمنٹ کالج میں میرا آخری سال تھا۔ بی۔اے کے امتحان کے لیے ہمیں فری کر دیا گیا تھا کہ اچانک ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے میری امتحان کی تیاری پر بڑا بُرا اثر پڑا۔ ہوا یوں کہ کالج میں ہڑتال ہوئی جو تین دن تک جاری رہی اور ہمارے مطالبات منظور کر لیے گئے تھے۔ جن میں ایک مطالبہ یہ تھا کہ کالج کو مستقل پرنسپل دیا جائے کیونکہ پروفیسر ظرافت اللہ صاحب عارضی پرنسپل کے طور پر عرصہ دو سال سے کام کر رہے تھے۔ جس سے کالج کا نظم درہم برہم ہو رہا تھا۔ نئے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر عطاء محی الدین آئے تو اُنہوں نے اسی ہڑتال کی کو وجہ قرار دیتے ہوئے سٹوڈنٹ یونین کے صدر اور سیکرٹری دونوں کو دو سال کے لیے کالج سے خارج کرنے کے احکامات صادر کر دیے۔ اور ہم تمام دوستوں کو اس قدر متفکر کر دیا کہ ہم امتحان کے تیاری کے بجائے ان احکامات کے بارے میں سوچنے لگے۔ طے یہ پایا کہ لاہور میں محمود قصوری صاحب سے جو کہ ملک کے بہترین وکیلوں میں شمار ہوتے تھے رابطہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم لاہور گئے، اُن سے ملاقات کی اور اس حکم کی کاپی اُن کے سامنے پیش کی کہ دیکھیے یہ حکم اُس وقت دیا گیا ہے جبکہ بی۔اے اور ایف۔اے کے امتحان سر پر آ چکے ہیں۔ قصوری صاحب نے کہا کہ اس حکم کو عدالت میں چیلنج کروں گا اور آپ سے کوئی فیس بھی نہیں لوں گا۔ جب ہمارے پرنسپل صاحب نے اس بارے میں سنا تو وہ بھی لاہور پنجاب ایڈووکیٹ جنرل سے ملے اور اُن سے کہا کہ آپ میری طرف سے میرے ان احکامات کی وکالت کریں۔ ایڈووکیٹ جنرل نے پرنسپل صاحب سے کہا کہ آپ کا کیس بہت کمزور ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ لڑکوں کے خلاف آپ نے جو حکم دیا ہے اُسے واپس لے لیں۔ چنانچہ پرنسپل صاحب اس پر راضی ہو گئے اور اُنہوں نے ہمارے وکیل محمود قصوری سے رابطہ کیا کہ لڑکوں کو کہیں کہ میں صلح پر راضی ہوں۔ محمود قصوری صاحب نے ہم سے رابطہ کیا تو ہم نے اُنہیں جواب میں یہی کہا کہ پرنسپل صاحب اپنا آرڈر واپس لینے پر تیار ہیں تو پھر مقدمہ دائر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس طرح یہ معاملہ تو طے ہو گیا لیکن اس عرصے میں ہمارا وقت ضائع ہوا۔ تاہم ہمارے دونوں لڑکے صدر سٹوڈنٹ یونین غلام محی الدین اور دوسرے سیکرٹری جنرل جن کا نام ذہن میں نہیں رہا دونوں بی۔اے اور ایف۔اے کے امتحانوں میں بیٹھے اور پاس ہوئے اس سے اُس پریشانی کا صلہ ہمیں مل گیا۔ ہمارے بی۔اے کے امتحان رمضان شریف میں ہوئے، روزہ رکھ کر میں نے بھی امتحان دیا اور اللہ نے کرم کیا کہ میں بھی پاس ہو گیا۔ اب میں نے ایم۔اے کے لیے لاہور کا رُخ کیا۔ اسلامیہ کالج اور

گورنمنٹ کالج کے ہاکی کھلاڑیوں سے میں نے رابطہ کیا تو دونوں نے مجھے اپنے اپنے کالج میں داخل ہونے کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ مجبور کیا۔ اس کی بنیادی وجہ میرا یونیورسٹی ہاکی ٹیم میں مسلسل چار سالوں تک کھیلنا تھا جس کی وجہ سے دونوں طرف کے کھلاڑی یہی چاہتے تھے کہ میں اُن کے کالج میں داخلہ لوں، بہرحال میں نے گورنمنٹ کالج لاہور کو ترجیح دی اور اُن کے کھلاڑیوں کے ذریعے اے۔ ایل کھوکھر صاحب سے، جو گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور ڈی۔ پی۔ ای کام کر رہے تھے اور پنجاب یونیورسٹی ہاکی ٹیم کے انچارج بھی تھے، اُن کے کمرے میں ملا اُنہوں نے بڑی کشادہ روئی کے ساتھ میرا داخلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں کرا دیا۔ اس طرح میں بی۔ اے کے بعد گورنمنٹ فیصل آباد سے گورنمنٹ کالج لاہور کا طالب علم بن گیا اگرچہ ایم۔ اے کی تمام کلاسیں پنجاب یونیورسٹی (اولڈ) میں ہوا کرتی تھیں، اس لیے گورنمنٹ کالج میں صرف ہاکی ہی کھیلنے کے لیے جانا ہوتا تھا پڑھائی کا سارا وقت یونیورسٹی میں ہی گزرتا تھا۔

پولیٹیکل سائنس ڈپارٹمنٹ:

میں نے ایم۔ اے کے لیے Political Science (علم سیاسیات) کا مضمون چن لیا۔ اس لیے سیاسیات کے شعبہ میں ہی سارے لیکچر ہوتے تھے۔ اس شعبہ کے انچارج ڈاکٹر فریٹر تھے جن کے بارے میں کہا یہ جاتا تھا کہ وہ ''جرمن جیو'' ہیں۔ وہ اُن یہودیوں میں سے تھے جو جرمنی میں قتل و غارت سے بچ کر ادھر اُدھر نکل گئے تھے عجیب و غریب قسم کی شخصیت تھے۔ انگریزی منہ میں ہی بولتے تھے۔ کچھ سمجھ میں آتا کچھ نہ آتا اُن کے لیکچر کا بھی یہی حال تھا۔ کم گو بھی تھے اور کم سمجھ بھی۔ بہرحال اپنے شعبے کے لیے پُرخلوص تھے اور خوب کام کرتے تھے۔ بعض اوقات تو وہ کمروں کی کھڑکیاں اور دروازے بھی خود کھولتے نظر آتے اور ساتھ ساتھ یہ بھی انگریزی میں کہتے ''کیا یہ یونیورسٹی ہے؟ یہاں کوئی دروازے ہی نہیں کھولتا کوئی ڈسک صاف نہیں کرتا، صرف ڈاکٹر فریٹر یہاں پر کام کرتا ہے کوئی اور نہیں۔ ڈاکٹر فریٹر دروازے کھول رہا ہے اور اور ڈاکٹر فریٹر ہی ڈیسک صاف کر رہا ہے۔'' ان کے علاوہ دوسرے پروفیسروں میں پروفیسر شوکت، پروفیسر بشیر، اور راجہ ایف۔ ایم تھے جو بی۔ اے میں بھی میرے استاد رہے تھے اور لاہور داخلہ لینے سے پہلے ہی گورنمنٹ کالج لاہور میں تبدیل ہو کر آ گئے تھے۔ راجہ صاحب سے ہم (Muslim Political Thought) پڑھتے تھے۔ بہرحال ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا، اگرچہ یہ آغاز بڑی بے سروسامانی اور معمولی وسائل کے ساتھ کیا گیا۔ لیکن الحمدللہ عزم بلند تھا اور ارادہ پختہ تھا۔ رہائش کا مسئلہ والد صاحب کے دوست خضر تمیمی ایڈووکیٹ نے حل کر دیا۔ اُن کے دفتر میں جو مزنگ روڈ پر تھا رہائش اختیار کر لی اور اس طرح پڑھائی شروع کر دی۔ صبح یونیورسٹی، دوپہر کو ہاکی کھیلنے کے لیے گورنمنٹ کالج کی ہاکی گراؤنڈ جسے عرفِ عام میں ''اُوول'' کہا جاتا تھا اور رات کو دفتر آ کر سو رہتے۔

ہم نے اپنے ڈپارٹمنٹ میں تین دوست تھے جنھوں نے گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے بی۔ اے کیا تھا۔ آغا ناصر، میاں اکبر جو میاں اظہر کے کزن بھی تھے اور بعد میں اُن کے بہنوئی بھی ہوئے یہ وہی میاں اظہر ہیں جو گورنر پنجاب

کے طور پر ملکی سیاست میں ایک نیک نام چھوڑ گئے۔ دن کو گورنر ہاؤس میں ہوتے رات کو اپنے گھر میں سوتے۔ فیصل آباد کے دوسرے دوست کچھ تو شعبہ معاشیات میں داخل ہوئے جس میں مظہر شیخ اور ڈاکٹر یعقوب جو بعد میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کے گورنر بنے۔ ادھر لا کالج اور ایف سی کالج میں بھی کئی دوست تھے، میاں زاہد سرفراز بی۔ اے میں فیل ہو گئے تھے۔ جب ہم سب دوست لاہور آ گئے تو پھر اُنہوں نے بھی لاہور کالج میں بی۔ اے میں داخلہ لینے کی کوشش کی مگر وہاں اُنہیں اس لیے داخلہ نہ ملا کہ وہ دو مضامین میں فیل تھے۔ اس لیے اُنہوں نے ایف۔ سی کالج میں داخلہ لے لیا اور ایف۔ سی کالج کے ہوسٹل میں رہائش اختیار کی۔ ان تمام دوستوں سے ملاقاتیں ہوتی اور جی لگا رہتا۔

شاہ جی (امیر شریعتؒ) سے لاہور میں ملاقاتیں:

۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک لاہور میں قیام کے دوران امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سے دو دفعہ ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات جیل روڈ پر صوفی عبدالحمید صاحب کی کوٹھی پر اور دوسری لاہور ریلوے سٹیشن پر۔ صوفی عبدالحمید صاحب کی کوٹھی پر تو اس وقت ملاقات ہوئی جب وہاں شاہ جی کے مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ قیام پذیر تھے اور شاہ جی ان سے ملنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ اُنہی دنوں مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کی وفات ہوئی تھی اور میں لاہور میں مزنگ روڈ پر جناب خضر تمیمی ایڈووکیٹ کے دفتر میں مقیم تھا۔ مولانا ابوالکلام کی وفات پر اخبارات میں اطلاع دی گئی کہ مولانا داؤد غزنویؒ موچی دروازے کے باہر آپ کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائیں گے چنانچہ میں اپنے ایک ساتھی جو چنیوٹ سے تعلق رکھتے تھے اور میرے ساتھ ہی تاریخ میں ایم۔ اے کی تیاری کر رہے تھے جن کا نام ممتاز سہارن تھا کے ہمراہ مزنگ روڈ سے موچی دروازے اس جنازے میں شرکت کے لیے وہاں پہنچ گیا۔ جنازے سے فارغ ہوا تھا کہ مجھے کسی جاننے والے نے بتایا کہ حضرت شاہ جی قبلہ حاجی عبدالمتین کی کوٹھی جو شملہ پہاڑی کے قریب تھی پر آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھی ممتاز سہارن سے پوچھا کہ آپ کا کیا پروگرام ہے اُنہوں نے کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ شاہ جی کو ملنے چلوں گا۔ چنانچہ ہم دونوں موچی دروازے سے حاجی عبدالمتین کی کوٹھی پر آئے تو ہمیں وہاں سے پتہ چلا کہ شاہ جی یہاں نہیں ٹھہرے ہوئے بلکہ وہ تو جیل روڈ پر صوفی عبدالحمید کی کوٹھی پر قیام پذیر ہیں، چنانچہ ہم دونوں وہاں سے پیدل چل کر صوفی عبدالحمید کی کوٹھی پر پہنچے حضرت شاہ جیؒ کوٹھی کے مشرقی لان میں اپنے عقیدت مندوں کے درمیان تشریف فرما تھے۔ جبکہ کوٹھی کے اندر ایک وسیع کمرے میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری تشریف فرما تھے۔ حضرت شاہ جی کو میں نے سلام عرض کیا اور کہا کہ حضرت آج تو میں آپ کے لیے بہت پیدل چلا ہوں۔ آپ سے ملاقات کا اشتیاق تھا اللہ کا شکر ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ تھکاوٹ ساری دور ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے علاوہ ملاقات کے لیے سارے سفر کی کہانی بھی سنا دی فرمانے لگے کہ:

''کیا یہ مجھ پر تمہارا کوئی احسان ہے؟ اپنے بیٹے ہو ملنے کے لیے آئے ہو، آؤ میرے پاس بیٹھو، میری طرف بھی

تو دیکھو اس عمر میں تین منزلہ ہسپتال پر گیا ہوں اور دانت لگوا کر آ رہا ہوں۔''

میں آپ کے پاس ہی بیٹھ گیا تذکرہ تو ہو رہا تھا مولانا آزاد کی عظمت کا اور زبان تھی امیرِ شریعت کی منہ سے الفاظ نہیں پھول جھڑ رہے تھے۔ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔تمام لوگ ہمہ تن گوش شاہ جی کی باتیں سن رہے تھے۔اور شاہ جی فرما رہے تھے:

''کیا یہ حکومت ہندوستان کا مولانا آزاد پر احسان تھا کہ اس نے مولانا آزاد کو وزیرِ تعلیم بنایا ہوا تھا؟ بھائی یہ تو مولانا ابوالکلام آزاد کا ہندوستان کی حکومت پر احسان تھا کہ اُن کی وزارتِ تعلیم کو قبول کر لیا۔میری تمام زندگی پڑھے لکھے لوگوں میں گزری ہے،ایسا عالم فاضل شخص میری نظروں سے کبھی نہیں گزرا،عربی جن کی مادری زبان ہو،اردو جس کے ہاتھ کی چھڑی،فارسی جس کے گھر کا پانی بھرتی ہو اور انگریزی بھی ایسی خوب جانتے تھے کہ (مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا) بابو تم بھی کیا جانو،وہ ہمارے دور کے واقعی امام ابنِ تیمیہ تھے۔کیا کیا خوبیاں تھیں جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل و دماغ میں سمو دی تھیں۔''

شاہ جی ابوالکلام آزاد کی شخصیت،کردار اور خدمات کا تذکرہ اپنے مخصوص انداز میں فرما رہے تھے اور میں بڑے غور سے اُن کے چہرے پر نگاہ دوڑا رہا تھا۔چہرے کے تاثرات میرے دل میں آج بھی تازہ ہیں کہ دل میں رہ رہ کر اس تاباں چہرے کی روشنی و نورانیت جھلملاتی ہے۔وہ اُس تذکرے سے مخمور تھے اور میں اُن کے نورانی چہرے سے دل و دماغ کو روشن کرتا ہوا اُن کی گفتگو میں محو تھا اتنے میں ایک آدمی نے آپ کے پاس آ کر کہا کہ:

''حضرت رائے پوری آپ کو اندر یاد فرما رہے ہیں''

وہ ماحول یکسر تبدیل ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔شاہ جی کا وہ چہرہ جو چند لمحے پہلے جگمگ کر رہا تھا اُس کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ایک بالکل مختلف کیفیت شاہ جی پر طاری ہو گئی اُن کی ہر اختیاری و اضطراری حرکت سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی طالب اپنے گرانقدر مطلوب کے پاس جا رہا ہے۔چہرے پر اب سرخی کی بجائے قدرے زردی تھی۔پہلے بے تکلفی کے تاثرات تھے اور اب اُس کی جگہ متانت اور سنجیدگی نے لے لی۔پہلے ننگے سر تھے،اب بڑے اہتمام سے سر پر رومال باندھ رہے تھے،کھڑے ہوئے اور عجز و انکساری کی تصویر بنے ایک سعادت مند مرید کی طرح ایک باکمال پیر کی بارگاہ کی طرف چل دیے،سب لوگ کھڑے ہو گئے اور ہم دونوں بھی لوگوں کے ساتھ کھڑے ہو کر حضرت امیرِ شریعت کے ساتھ اُن کے پیچھے پیچھے چل تو پڑے تھے لیکن کمرے کے دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے کہ اندر وسیع کمرے میں تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا،وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے زندگی میں پہلی مرتبہ حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔یہ پہلی اور آخری زیارت تھی۔ایک بڑے پلنگ کے ایک کونے میں حضرت تشریف فرما تھے۔بالکل نحیف و نزار،انتہائی ضعیف جیسے گوشت اور ہڈیوں کی ایک ڈھیری سی کسی نے بستر پر رکھ دی ہو۔شاہ جی بھی

انتہائی ادب کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور سلام عرض کیا اور حضرت رائے پوری کی چارپائی کے ساتھ چپکے سے زمین پر بیٹھنے لگے تو حضرت رائے پوریؒ نے ارشاد فرمایا کہ:

''نہیں شاہ جی آپ اوپر میرے ساتھ چارپائی پر تشریف رکھیں'' شاہ جی فوراً اُن کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اُن کی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہم دروازے پر کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے کہ کیسے ایک مرید اور پیر کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ اب کمرے میں بیٹھے تمام لوگ شاہ جی کے سامنے تھے شاہ جی ہمارے سامنے، شاہ جی کو حضرت رائے پوری نے فرمایا کہ:

''آپ کو اس لیے بلوایا ہے کہ آپ ان لوگوں کو وعظ فرمائیں''

بس پھر کیا تھا۔ وہ شاہ جی جو لاکھوں کے مجمع میں اپنی گرجدار آواز سے تقریر کرتے کئی مرتبہ سنے اور دیکھے گئے انتہائی کمزور آواز میں واقعی وعظ فرما رہے تھے۔ یہ تو مجھے اس دن معلوم ہوا کہ تقریر اور وعظ میں کیا فرق ہوتا ہے۔ دیر تک ہم بھی دروازے پر کھڑے کھڑے آپ کے وعظ سے مستفیض ہوتے رہے۔ جس کے بعد چونکہ ہمیں دیر ہو رہی تھی اور ہم نے اپنی منزل ۴ مزنگ روڈ تک جو وہاں سے خاصی دور تھی، پیدل ہی جانا تھا اپنے شاہ جی کو اُن کے پیر کے سپرد کر کے واپس چلے آئے۔

احرار سے پابندی اٹھا دی گئی: (۱۹۵۸ء)

۱۹۵۸ء میں جب مغربی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ خان عبدالغفار خان کے صاحبزادے ڈاکٹر خان صاحب تھے، انہوں نے ۱۹۵۳ء میں مجلس احرار اسلام پر لگائی گئی پابندی کو ختم کر دیا۔ مجلسِ احرار اسلام کو دوبارہ فعال بنانے کے لیے امیر شریعت کے حکم کے مطابق جماعت کی تنظیم نو کے لیے لاہور میں ہی مولانا داؤد غزنوی کے مدرسہ دار العلوم کے وسیع کمرے میں احرار کنونشن بلایا گیا تھا، اس وقت میں ایم۔ اے فائنل ائیر کا طالب علم تھا اور میں بھی سرخ قمیص پہن کے اس کنونشن میں شامل ہوا تھا۔ ملک بھر سے سرخ قمیصوں میں ملبوس رضا کاروں کے علاوہ ماسٹر تاج دین انصاری اور شیخ حسام الدین بھی اس احرار ورکرز کنونشن میں شریک ہوئے تھے۔ جذبات کی حدّت تھی کہ قافلۂ اہلِ جنوں پھر سے جانب منزل روانہ ہونے والا ہے۔ اور پھر وہی گھمسان کا رن پڑنے والا ہے۔ سلسلہ وہیں سے شروع ہوگا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وسیع و عریض کمرہ رضا کاروں سے بھرا ہو میدان کارزار میں دوبارہ کودنے کے لیے بے تاب نظر آ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک رضا کار پھر سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کے تحفظ کے لیے سینے پر گولی کھانے اور جیل جانے کے لیے تیار ہے۔ پھر ناموسِ مصطفیٰ کے تحفظ کے لیے قادیانیوں کو آئینی سطح پر غیر مسلم منوانے کے لیے اور اُنہیں اعلیٰ عہدوں سے معزول کرنے کے لیے ہر نوع کی جانی، مالی قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ اور یہ سب زمانے کو بتانا چاہتے ہیں کہ

بدل سکا نہ زمانہ میرا طریقِ جنوں
وہی جو لے تھی پرانی نوائے چنگ وہی

وہی ہیں زخم پرانے وہی ہے خونِ شعور
کماں وہی ہے، نشانہ وہی، خدنگ وہی
جنوں و عقل میں ان بن وہی پرانی ہے
وہی ہے سر میں جو سودائے میر تو سنگ وہی

قبیلہ احرار ایک مرتبہ پھر اپنی صفوں کو درست کر کے میدانِ کارزار میں کودنے کے لیے تیار نظر آ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر نظیری کا وہ شعر میرے ذہن سے زبان تک آ گیا۔ شاید یہ شعر نظیری نے احرار کارکنوں اور احرار رہنماؤں کے لیے ہی کہا ہو۔

گریزد از صفِ ما ہر آنکہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

اس کنونشن میں ضیغمِ احرار شیخ حسام الدین کو چیف آرگنائزر بنایا گیا تھا تا کہ وہ پاکستان بھر میں مجلس احرارِ اسلام کو دوبارہ منظّم کریں۔ لیکن اس سے پہلے جب کہ تلاوتِ قرآن پاک کے بعد اجلاس باقاعدہ شروع ہوا تو ایک واقعہ جسے میں کبھی نہ بھول پاؤں گا یہ ہوا کہ کہ شیخ صاحب جو سرخ قمیص میں ملبوس اپنی مخصوص جگہ پر تشریف فرما تھے اُن سے فیصل آباد کے کارکن خواجہ غلام حسین نے سوال کیا کہ:

''کیا میں شیخ صاحب سے یہ سوال کر سکتا ہوں اُن سے پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کس حیثیت میں یہاں تشریف فرما ہیں۔''

اس پر سارے ماحول میں عجیب وغریب کیفیت طاری ہوگئی۔ پوچھنے والے کا روئے سخن اس طرف تھا کہ آپ تو احرار کو چھوڑ کر عوامی لیگ سہروردی کی جماعت میں چلے گئے تھے یہاں کیسے تشریف فرما ہیں؟ اگر چہ شیخ صاحب اور ماسٹر صاحب پہلے دونوں مسلم لیگ میں شامل ہوئے، اس فیصلہ کے مطابق جو جماعت نے ۱۹۴۹ء کی کانفرنس میں کیا تھا کہ جماعت اب دینی محاذ پر کام کرے گی جنہیں سیاسی کام کرنا ہے وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ مسلم لیگ کے مزاج میں وہ نہ کھپ سکے تو اُنہوں نے سہروردی کی جماعت میں شمولیت کر لی تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس طرح سے شیخ صاحب سے سوال کر کے پوچھی جاتی۔ تاہم پوچھنے والے نے بھری مجلس میں پوچھ لیا۔ جواب میں شیخ صاحب نے انتہائی غصے میں جواب دیا:

''بیٹھ جا او توں مینوں پچھن والا کون اے''

یعنی تم کون ہوتے ہو مجھ پر یہ سوال کرنے والے۔ اس پر وہ رضا کار غلام حسین خواجہ تو بیٹھ گیا لیکن ایک طرف سے ایک دوسرے کونے سے ایک رضا کار نے کھڑے ہو کر کہا کہ:

''شیخ صاحب آپ سے سوال کیا گیا ہے آپ آرام سے سوال کا جواب بھی دے سکتے تھے۔ آپ کو اس طرح ایک مخلص رضا کار کو جھاڑنے کا حق کس نے دیا ہے۔ اگر آپ کو اپنی قائدانہ صلاحیتوں پر ناز ہے تو ہمیں اپنی رضا کارانہ

صلاحیتوں پر بھی فخر ہے۔آپ کے لہجے کی تلخی نہ ہمارے خلوص اور ہماری جماعت کے ساتھ محبت کا خون کیا ہے جس کا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔''

میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شیخ حسام الدین جیسے مجلس احرار اسلام کے مقتدر اور منفرد رہنما نے اپنے ایک رضا کار سے سب کچھ سن کر جو ایک اچھی خاصی جھاڑ اور سرزنش بھی کہا جا سکتا ہے انتہائی خاموشی اختیار کر لی اور اپنی گردن پورے کنونشن کے دوران جھکائے رکھی۔ سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ یہ ہے وہ بڑائی جس نے آج تک ان رہنماؤں کی عظمت کا ہمیں گرویدہ بنایا ہوا ہے اور ہم رضا کار، اُن رہنماؤں کی عظمت کے ترانے گاتے نہیں تھکتے۔آج کی سیاسی و دینی جماعتیں کوئی ایسی مثال اپنی صفوں سے پیش کر کے دکھائیں۔ ہمارے رضا کار ہمارے رہنماؤں کے لیے فخر اور ناز ہوا کرتے تھے اور ہمارے رہنما ہمارے رضا کاروں کے دل و دماغ پر اسی لیے مسلط تھے اور وہ اُن کی ہر بات پر لبیک کہہ کر جیل بھی چلے جاتے تھے اور سینے پر گولی کھانے کے لیے بھی تیار ہو جاتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی اُنہی شیخ حسام الدینؒ کو پورے کنونشن نے اپنا چیف آرگنائزر بنایا۔

لاہور ریلوے سٹیشن پر امیر شریعت سے ملاقات:

اُسی اعلان کے تحت جو کنونشن کے خاتمے پر کیا گیا تقریباً پانچ چھے سو کے لگ بھگ رضا کاروں احرار اپنی سرخ وردی میں رات ریلوے سٹیشن پر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے استقبال کرنے کے لیے بے تاب نظر آرہے تھے ہر ایک کی نگاہ ریلوے لائن کی اس سمت لگی تھی جدھر سے اُن کے محبوب رہنما نے آنا تھا۔ایک ایک پل بڑی مشکل سے گزرتا تھا آخر گاڑی پلیٹ فارم کے قریب آئی تو امیر شریعت زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے پورا ریلوے سٹیشن گونج اٹھا۔رضا کاروں نے پورے پلیٹ فارم پر صف بنا کر کھڑے تھے اور نعرے لگا رہے تھے اب کسی رضا کار کو اس بات کا پتہ تو نہیں تھا کہ امیر شریعت کس ڈبے میں ہیں۔اسے محض اتفاق سمجھیے یا پھر میری محبت کا اثر کہ جہاں پر میں کھڑا تھا وہیں پر شاہ جی کا وہ ڈبہ آن کرُکا جس میں آپ تشریف فرما تھے۔میں نے جلدی میں اُن کے ڈبے میں جا کر سلام کیا، اُنہوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا یہ میرا سامان ہے اِسے اٹھا لو۔میں نے اُن کا سامان اٹھایا۔وہ باہر آئے۔لیکن اس دفعہ ایک خاص بات جو میں نے کبھی اس سے پہلے امیر شریعت میں نہیں دیکھی، اور میں اس پر حیرت زدہ بھی ہوا کہ انہوں نے استقبالی رضا کاروں کی شان و شوکت اور جوش و جذبے کے مقابلے میں انتہائی بے نیازی کا مظاہرہ کیا، آنکھ اُٹھا کر کسی کی طرف نہیں دیکھا نہ اُن کے چہرے سے اتنے زبردست استقبال کا کوئی مسرت آمیز تاثر ظاہر ہوا۔بس وہ چل رہے تھے لوگ سلام کرتے تو جواب دیتے، ہاتھ ملاتے اور آگے کی طرف چلتے رہے نہ کہیں رُکے نہ کسی سے کوئی بات کی۔ایک پُل سے گزرتے ہوئے میں سامان اٹھائے اُن کے ساتھ قدم سے قدم ملاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔کہ ہم سٹیشن کے

مین گیٹ سے باہر آئے تو ڈیوڑھی میں سٹیشن کے باہر ایک کار کھڑی تھی۔ اس کار سے کوئی آدمی باہر آئے اُنھوں نے مجھ سے شاہ جی کا سامان لیا اور شاہ جی چپکے سے کچھ کہے بغیر کار میں سوار ہو کر چلے گئے۔ کدھر گئے کس لیے آئے وہاں پر تو یہی تاثر تھا کہ شاید وہ اپنے پیرو مرشد کو ملنے کے لیے لاہور آئے ہیں۔ یہ شاہ جی کے ساتھ میری سب سے انوکھی ملاقات تھی۔

دفتر روزنامہ آزاد میں ملازمت:

اُن دنوں میں اپنی مالی بے سروسامانی کی وجہ سے کچھ پریشان رہتا تھا۔ چاہتا تھا کہ کہیں کوئی ''پارٹ ٹائم'' نوکری یا پھر کوئی ٹیوشن کی صورت بن جائے تو آسانی ہو۔ لیکن ایسا ہو نہیں رہا تھا کہ میں نے آزاد اخبار میں اشتہار پڑھا کہ اخبار کو ایک نیوز سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں بھی انٹرویو کی غرض سے دفتر روزنامہ آزاد کے دفتر پہنچ گیا، اُن دنوں رائل پارک میں روزنامہ آزاد کا دفتر تھا۔ اخبار تو جماعت کا تھا لیکن جماعت پر پابندی کی وجہ سے اب اس کا جماعت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ایڈیٹر بھی میرے لیے اجنبی تھے۔ کئی لڑکے انٹرویو کے لیے اکٹھے تھے۔ ایڈیٹر کی طرف سے ایک خبرنامہ انگریزی زبان میں ہمارے سامنے رکھ دیا گیا جو سرکاری طور پر پچھلے پہر شعبہ اطلاعات کی طرف سے تمام روزناموں کو جاری کیا جاتا تھا۔ ہمیں کہا گیا کہ ان خبروں کا اردو میں ترجمہ کرو اور پھر اسے خبر کی صورت میں ڈھال کر میرے سامنے پیش کرو۔ میں ایف۔ اے اور بی۔ اے کے دوران روزنامہ آزاد کا فیصل آباد میں نمائندہ رہ چکا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب روزنامہ آزاد کے ایڈیٹر مولانا مجاہد الحسینی ہوا کرتے تھے اور اس کا دفتر مجلس احرار اسلام کے دفتر ساتھ دہلی دروازے کے باہر تھا۔ اس لیے مجھے اس امتحان میں کوئی دقت نہ ہوئی اور میں نے ایسا ترجمہ کیا اور اس طرح سے اسے خبر کی صورت دی کہ کاتب کو دقت محسوس نہ ہو۔ ایڈیٹر صاحب نے سب کو دیکھ کر فیصلہ میرے حق میں کر دیا اور مجھے کہا گیا کہ آپ کل شام کے بعد روزانہ دفتر میں آ جایا کریں۔ ہم نے آپ کو روزنامہ آزاد کا نیوز سب ایڈیٹر منتخب کر لیا ہے، اس پر میں بہت خوش ہوا کہ ایک ایسے اخبار میں کام کرنے کا موقع ملے گا جو کبھی تو ہمارا تھا اگرچہ اب جماعت کے پاس نہیں ہے۔ پورا مہینہ میں نے کام کیا۔ رات کو ایک دو بجے کے بعد جب اخبار پریس جاتا تو چھٹی ملتی، جو کام بھی میرے ذریعے ہوتا وہ پسند بھی کیا جاتا اور حوصلہ افزائی بھی ہوتی۔ رائل پارک سے مزنگ روڈ پر آتے آتے دو تین بج جاتے، رات کو نیند پوری نہ ہوتی۔ تاہم روزانہ معمول کے مطابق نہا دھو کر یونیورسٹی چلا جاتا اور پھر شام کو ہاکی کے میدان میں۔ لیکن سانحہ یہ ہوا کہ ایک ماہ گزرنے کے بعد جب میں نے اپنے معاوضے کا تقاضہ کیا تو لیت ولعل سے کام لیا گیا۔ میں نے یہ سمجھ لیا کہ یہاں سے بھی مجھے کچھ نہیں مل سکے گا تو پھر میں نے یہ ملازمت بغیر کچھ وصولی کے چھوڑ دی۔ اور دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ زندگی میں یوں بھی ہوتا ہے۔ ایسے حالات برداشت کیے بغیر منزل کی راہ ختم نہیں ہوتی۔ **جاری ہے**